ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY

Name:

Registration No.:

Course Code: 1970

Program: BS Islamic Studies (Spec. Qur'an & Tafsir)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ — شعبہ قرآن وتفسیر

کورس: منتخب قرآنی موضوعات کا مطالعہ (1970)

سطح: بی ایس علوم اسلامیہ (تخصص قرآن وتفسیر)

سمسٹر: خزاں 2026ء

امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ نمبر: 1 تا 5)

کل نمبر: 100 — کامیابی کے نمبر: 50

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

(مطالعہ ورہنمائی کے لیے)

نوٹ: یہ حل شدہ گائیڈ صرف مطالعہ اور رہنمائی کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ سے گزارش ہے کہ وہ نصابی کتاب کے متعلقہ یونٹس کا مطالعہ کر کے مفاہیم کو اچھی طرح سمجھیں اور امتحانی مشق اپنے الفاظ اور اپنے اندازِ تحریر میں لکھیں، کیونکہ ہو بہو نقل کی گئی مشق قواعد کے مطابق قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ اس گائیڈ میں قرآنی حوالے سورت اور آیت کے نمبر کے ساتھ دیے گئے ہیں؛ آیات کے مفاہیم مشہور اردو تراجم کی روشنی میں اپنے الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں، اس لیے اصل عربی متن اور ترجمے کی تصدیق کے لیے مصحف اور نصابی کتاب سے رجوع ضرور کریں۔

سوال نمبر1: قرآن مجید عقیدہ توحید کو انسانی زندگی کی بنیاد کیوں قرار دیتا ہے؟ وضاحت کریں۔(20نمبر)

تعارف

قرآن مجید کی دعوت کا سب سے پہلا اور سب سے بنیادی نکتہ عقیدہ توحید ہے۔ قرآن جس جگہ سے بھی اپنی گفتگو کا آغاز کرتا ہے، وہیں سے وہ ایک ہی مرکز کی طرف لوٹتا ہے کہ اس کائنات کا خالق، مالک، مدبر اور معبود صرف ایک اللہ ہے؛ اس کا کوئی شریک نہیں، نہ ذات میں، نہ صفات میں، نہ اختیارات میں اور نہ عبادت میں۔ سورۃ الاخلاص میں اس عقیدے کو چار مختصر جملوں میں سمیٹ دیا گیا ہے کہ اللہ ایک ہے، بے نیاز ہے، نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ بیٹا، اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ سوال یہ ہے کہ قرآن اس عقیدے کو محض ایک مذہبی خیال کے طور پر نہیں بلکہ پوری انسانی زندگی کی بنیاد کیوں قرار دیتا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ بنیاد وہ چیز ہوتی ہے جس پر پورا ڈھانچہ کھڑا ہوتا ہے؛ اگر بنیاد درست اور مضبوط ہو تو عمارت سیدھی کھڑی رہتی ہے، اور بنیاد ٹیڑھی ہو تو دیواریں بھی ٹیڑھی ہو جاتی ہیں۔ انسانی زندگی کا ڈھانچہ عقیدے، عبادت، اخلاق، معاملات اور معاشرتی تعلقات پر مشتمل ہے، اور قرآن کے نزدیک ان سب کی سمت، معنویت اور استحکام اسی وقت درست رہتا ہے جب انسان اپنے آپ کو ایک خدا کے بندے اور اس کے سامنے جواب دہ سمجھے۔ اس جواب میں ہم مرحلہ وار دیکھیں گے کہ توحید انسان کو ذہنی وحدت، اخلاقی آزادی، انسانی مساوات، مقصدِ زندگی کی یکسوئی اور معاشرتی اتحاد کیسے عطا کرتی ہے، اور یہی وجوہات اسے زندگی کی بنیاد بناتی ہیں۔

توحید کا مفہوم اور قرآن کا مرکزی موضوع ہونا

توحید عربی لفظ ”وحد“ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ایک قرار دینا۔ اصطلاحاً عقیدہ توحید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی ذات، صفات، افعال اور حقوق میں یکتا مانا جائے؛ یعنی وہی خالق ہے، وہی رازق ہے، وہی زندگی اور موت کا مالک ہے، قانون سازی کا حتمی اختیار اسی کے پاس ہے، اور عبادت، دعا، نذر اور اطاعتِ مطلق کا مستحق بھی وہی ہے۔ قرآن مجید کی مکی سورتوں کا غالب موضوع یہی عقیدہ ہے، کیونکہ مکہ کی تیرہ سالہ دعوت میں پہلے انسان کے ذہن اور دل کو بدلا گیا، عبادات اور قوانین بعد میں ترتیب پائے۔ یہ ترتیب خود ایک بڑا ثبوت ہے کہ قرآن توحید کو پہلی اینٹ سمجھتا ہے۔ سورۃ البقرہ کی آیت الکرسی میں اللہ کی حیات، قیومیت، اور ہر چیز پر محیط علم و قدرت کو بیان کر کے بتایا گیا ہے کہ جس

ہستی کی شان یہ ہو، اس کے ہوتے ہوئے دوسرا کوئی معبود یا سفارشی کس حیثیت سے کھڑا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح سورۃ الانعام، سورۃ ہود اور سورۃ النحل میں توحید کو کھیتوں، باغات، بارش، مویشیوں اور انسان کی اپنی پیدائش جیسی روزمرہ نعمتوں سے جوڑ کر پیش کیا گیا ہے، تاکہ یہ عقیدہ کتابی بات نہ رہے بلکہ انسان کے مشاہدے اور تجربے کی حقیقت بن جائے۔

عقلی اور فطری بنیاد: ایک خالق، ایک نظام

قرآن توحید کو انسانی زندگی کی بنیاد اس لیے قرار دیتا ہے کہ یہ کائنات کی سب سے بڑی حقیقت کے عین مطابق ہے۔ انسان جب اپنے گرد و پیش پر نظر دوڑاتا ہے تو اسے ہر جگہ یکسانیت اور نظم دکھائی دیتا ہے: سورج کا مقررہ مدار، موسموں کی ترتیب، بارش اور فصلوں کا باہمی ربط، اور انسانی جسم کے اندر لاکھوں نظاموں کا ہم آہنگ چلنا۔ قرآن سوال اٹھاتا ہے کہ اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا دوسرے معبود بھی اختیار رکھتے ہوتے تو دونوں کا نظام بگڑ جاتا، کیونکہ ہر صاحب اختیار اپنی مرضی چاہتا ہے (سورۃ الانبیاء: 22)۔ یہ دلیل آج کے انسان کے لیے بھی یکساں مضبوط ہے: جس کائنات کے قوانین ایک ہیں، اس کا قانون ساز بھی ایک ہے۔ دوسری طرف انسان کی اپنی فطرت بھی وحدت کی طرف جھکی ہوئی ہے؛ جب بھی کوئی بڑی مصیبت آتی ہے تو زبان، قوم اور مذہب کے فرق کے باوجود انسان بے اختیار ایک ہی برتر طاقت کو پکار اٹھتا ہے۔ قرآن اس فطری رجحان کو "فطرت اللہ" کہتا ہے جس پر انسان کو پیدا کیا گیا ہے (سورۃ الروم: 30)۔ جو عقیدہ کائنات کی حقیقت اور انسان کی فطرت دونوں سے ہم آہنگ ہو، اسی کو زندگی کی بنیاد ہونا چاہیے؛ باقی نظریے یا تو مشاہدے سے ٹکراتے ہیں یا فطرت سے۔



Figure 1: Tawhid as the foundation of human life in the Quranic view

شکل 1: توحید — انسانی زندگی کی بنیاد؛ عقیدہ، عبادت، اخلاق اور معاشرت اسی پر قائم ہوتے ہیں۔

انسانی ذہن کی وحدت اور ذہنی آزادی

توحید کا پہلا عملی ثمر انسان کے ذہن کی وحدت اور آزادی ہے۔ شرک اور خرافات کے ماحول میں انسان ہر قدم پر کسی نہ کسی طاقت سے ڈرتا ہے: کبھی ستاروں سے، کبھی جنات سے، کبھی پیروں فقیروں کی ناراضی سے، کبھی "نصیب خراب" ہونے کے وہم سے۔ یہ خوف انسان کی قوتِ فیصلہ کو مفلوج کر دیتا ہے۔ توحید انسان کو یہ بتا کر ان تمام خوفوں سے آزاد کر دیتی ہے کہ نفع و نقصان کا اصل مالک ایک اللہ ہے؛ مخلوق میں سے کوئی اس کی اجازت کے بغیر نہ کچھ دے سکتا ہے نہ چھین سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ موحد انسان نہ کسی انسان کے سامنے جھکتا ہے، نہ خوشامد کرتا ہے، نہ رزق کے لیے حرام راہ اختیار کرتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ رزق کا وعدہ خالق نے خود کیا ہے (سورۃ ہود: 6)۔

اسی ذہنی آزادی نے تاریخ میں وہ کردار پیدا کیے جو بادشاہوں کے درباروں میں بھی سچ بولنے سے نہ جھجکے۔ اس کے برعکس، جب انسان کا مرکز ایک نہ رہے تو اس کی شخصیت ٹکڑوں میں بٹ جاتی ہے: وہ گھر میں کچھ ہوتا ہے، بازار میں کچھ، اور تنہائی میں کچھ اور۔ قرآن اس بکھراؤ کو "متفرق ارباب" کی مثال سے سمجھاتا ہے کہ ایک آقا والے غلام اور کئی آقاؤں والے غلام کی زندگی برابر نہیں ہو سکتی (سورۃ یوسف: 39)۔ لہٰذا ذہنی یکسوئی، نفسیاتی سکون اور آزاد کردار کے لیے توحید بنیاد ہے۔

انسانی مساوات اور عزتِ نفس کی بنیاد

توحید انسانی زندگی کی بنیاد اس لیے بھی ہے کہ یہ تمام انسانوں کو ایک ہی سطح پر کھڑا کر دیتی ہے۔ جب سب کا خالق ایک ہے، سب ایک ہی باپ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، اور سب کو اسی ایک عدالت میں پیش ہونا ہے، تو نسل، رنگ، زبان، قوم اور دولت کسی برتری کی بنیاد نہیں رہ سکتی۔ قرآن اعلان کرتا ہے کہ اللہ کے نزدیک سب سے باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے (سورۃ الحجرات: 13)۔ یہ اصول توحید ہی سے نکلتا ہے، کیونکہ اگر ہر قوم کا الگ خدا یا الگ مقدس نسل ہو تا تو برتری کے مصنوعی پیمانے قائم رہتے۔ توحید نے انسان کو بتایا کہ وہ اشرف المخلوقات اس لیے ہے کہ وہ اللہ کا بندہ اور زمین میں اس کا خلیفہ ہے (سورۃ البقرہ: 30)، نہ اس لیے کہ وہ کسی خاص خاندان میں پیدا ہوا۔ اس عقیدے نے غلاموں، عورتوں اور کمزور طبقات کو وہ عزت دی جو اس سے قبل تاریخ انسانیت میں کہیں نہ ملی۔ عملی زندگی میں بھی اس کا مشاہدہ ہوتا ہے: ایک ہی صف میں بادشاہ اور مزدور کا کھڑا ہو جانا، ایک ہی لباس میں امیر و غریب کا حج کرنا، اور ایک ہی سجدے میں سب پیشانیوں کا خاک پر جھک جانا، یہ سب توحید کی تعلیم کے زندہ مظاہر ہیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ انسانی مساوات کا فلسفہ کاغذوں میں بہت ملتا ہے، مگر اس کی عملی بنیاد توحید ہی فراہم کرتا ہے۔

اخلاق، عبادت اور قانون کا واحد ماخذ

زندگی کی بنیاد وہی چیز بن سکتی ہے جو انسان کو خیر و شر کا مستقل پیمانہ دے سکے۔ اگر اخلاق کا ماخذ انسان کی خواہش ہو تو جو چیز آج جرم ہے وہ کل فیشن بن جاتی ہے؛ اگر رسم و رواج ہو تو ہر معاشرے کا سچ الگ ہو جاتا ہے؛ اور اگر حکمران کی مرضی ہو تو قانون ظلم کا آلہ بن جاتا ہے۔ توحید انسان کو وہ ماخذ دیتی ہے جو زمان و مکان سے بلند ہے: ایک علیم و حکیم اور عادل خدا کی رضا۔ قرآن نماز کو بے حیائی اور برائی سے روکنے والی (سورۃ العنکبوت: 45)، زکاۃ کو مال اور نفس کی پاکیزگی کا ذریعہ (سورۃ التوبہ: 103)، اور روزے کو تقویٰ پیدا کرنے کا وسیلہ (سورۃ البقرہ: 183) قرار دیتا ہے۔ یہ تمام احکام اس وقت معنی رکھتے ہیں جب ان کے پیچھے ایک اللہ کی اطاعت کا عقیدہ موجود ہو۔ اسی طرح سچائی، امانت، وعدے کی پابندی اور عدل و احسان کا حکم (سورۃ النحل: 90) کسی انسانی مجبوری سے نہیں بلکہ اللہ کے حکم ہونے کی وجہ سے واجب بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موحد کی اخلاقی

زندگی میں وہ ثبات پیدا ہوتا ہے جو صرف فائدے اور نقصان کے حساب سے اخلاق اختیار کرنے والے میں نہیں ہوتا۔ خلاصہ یہ کہ توحید نے خیر کو خالق کی رضا سے جوڑ کر اخلاق و قانون کو وہ مضبوط بنیاد دے دی جس پر ایک پاکیزہ فردی اور اجتماعی زندگی تعمیر ہو سکتی ہے۔

جدول 1: عقیدہ توحید کے انسانی زندگی پر بنیادی اثرات

پہلو	توحید کا کردار	عملی ثمر
عقیدہ و فکر	یک خالق و مالک پر یقین	ذہنی یکسوئی، وہم و خرافات سے نجات
عبادت	اطاعت و بندگی صرف اللہ کے لیے	اخلاص، وقت کی پابندی، روحانی سکون
اخلاق	خیر و شر کا معیار اللہ کی رضا	سچائی، امانت، عدل اور تقویٰ میں ثبات
معاشرت	تمام انسان ایک خالق کی مخلوق	مساوات، بھائی چارہ، ظلم و تعصب کا خاتمہ
قانون و ریاست	حاکمیتِ اعلیٰ اللہ کی	حکمران بھی قانون کے تابع؛ احتساب کا شعور
آخرت کی جواب دہی	ہر عمل کا حساب ایک عادل خدا کے سامنے	خلوت و جلوت میں یکساں نیکی

مقصدِ زندگی کی وضاحت اور آخری استدلال

انسانی زندگی کی بنیاد کے لیے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ انسان دنیا میں آیا کیوں ہے؟ اگر یہ سوال جواب سے خالی رہے تو دولت، شہرت اور لذت کے حصول ہی مقصد بن جاتے ہیں اور ان کے حصول میں ناکامی انسان کو مایوسی، خودکشی اور جرائم تک لے جاتی ہے۔ توحید اس سوال کا واضح جواب دیتی ہے: انسان اللہ کا بندہ ہے؛ زمین میں اس کی خلافت کا امین ہے؛ اور اس کی زندگی آزمائش ہے کہ کون بہتر عمل کرتا ہے (سورۃ الملک: 2)۔ جب مقصد واضح ہو جائے تو زندگی کے تمام شعبے اسی ایک محور کے گرد گھومنے لگتے ہیں: علم حاصل کرنا بھی عبادت بن جاتا ہے، روزی کمانا بھی، خاندان کی پرورش بھی اور معاشرے کی خدمت بھی۔ قرآن نے اسی لیے توحید کی شہادت کو دنیا و آخرت کی

کامیابی کی کنجی قرار دیا اور ہر نبی کی دعوت کا آغاز اسی جملے سے ہوا کہ اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ جن قوموں نے اس بنیاد کو چھوڑا، وہ مادی ترقی کے باوجود اخلاقی زوال، طبقاتی کشمکش اور روحانی خلا کا شکار ہوئیں۔ اس کے مقابلے میں توحید پر قائم ہونے والی امت نے صدیوں تک علم، عدل اور تہذیب کی قیادت کی۔ یہ تمام دلائل مل کر ثابت کرتے ہیں کہ قرآن کا توحید کو زندگی کی بنیاد قرار دینا محض مذہبی دعویٰ نہیں بلکہ انسان کی فطرت، عقل، اخلاق اور معاشرتی ضرورت کے عین مطابق فیصلہ ہے۔

اختتام

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید عقیدہ توحید کو انسانی زندگی کی بنیاد اس لیے قرار دیتا ہے کہ یہی عقیدہ انسان کو ایک خالق سے جوڑ کر اس کے ذہن کو وحدت، دل کو سکون، کردار کو استقامت، معاشرے کو مساوات اور زندگی کو مقصد عطا کرتا ہے۔ بنیاد کے بغیر عمارت کا تصور ممکن نہیں؛ اسی طرح توحید کے بغیر نہ عبادت میں اخلاص پیدا ہوتا ہے، نہ اخلاق میں ثبات، نہ قانون میں عدل اور نہ معاشرے میں اتحاد۔ طالب علم کے لیے سبق یہ ہے کہ وہ توحید کو صرف ایک نظریاتی عقیدہ سمجھ کر نہ پڑھے بلکہ اپنی عملی زندگی میں دیکھے کہ اس کے فیصلے، خوف، امیدیں اور محبتیں کس مرکز کے گرد گھومتی ہیں؛ جہاں یہ مرکز درست ہو جائے، وہیں سے قرآنی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔

سوال نمبر 2: عقیدہ رسالت کی اہمیت قرآن مجید کی روشنی میں بیان کریں۔ (20 نمبر)

تعارف

توحید کے بعد قرآن مجید کا دوسرا بنیادی عقیدہ رسالت ہے، یعنی یہ ماننا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے برگزیدہ بندوں کو رسول بنا کر بھیجا، ان پر وحی نازل کی، اور آخری اور کامل ہدایت حضرت محمد ﷺ کے ذریعے عطا فرمائی۔ قرآن مجید میں جہاں بھی ایمان کا ذکر آیا ہے، وہاں اللہ پر ایمان کے ساتھ اس کے رسولوں پر ایمان کو لازم قرار دیا گیا ہے، اور سورۃ النساء میں صراحت ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کرے اور بعض کو مانے اور بعض کا انکار کرے، وہ حقیقی ایمان سے محروم ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر رسالت کی اتنی اہمیت کیوں ہے؟ کیا انسان اپنی عقل سے راستہ نہیں پا سکتا تھا؟ قرآن اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ عقل اشیاء کی ماہیت اور دنیا کے معاملات میں

بہت کچھ جان سکتی ہے، مگر اللہ کی ذات و صفات کی معرفت، مرنے کے بعد کی زندگی کی خبر، عبادت کا درست طریقہ اور پسندیدہ اخلاق کا جامع نمونہ صرف وحی اور رسول کے ذریعے ہی مل سکتا ہے۔ رسول صرف پیغام پہنچانے والا ڈاکیہ نہیں ہوتا؛ وہ اس پیغام کی زندہ تفسیر اور چلتی پھرتی صورت ہوتا ہے۔ اس جواب میں ہم رسالت کی اہمیت کو قرآن کی روشنی میں وحی کے ذریعے ہدایت، عملی نمونہ، شریعت کی تکمیل، انبیاء کے تسلسل اور ختمِ نبوت کے پہلوؤں سے واضح کریں گے۔

رسالت کا مفہوم اور اس کی ضرورت

رسالت کے لفظی معنی ہیں پیغام بھیجنا؛ اصطلاح میں اس سے مراد وہ منصب ہے جس میں اللہ تعالیٰ کسی انسان کو منتخب فرما کر اسے اپنی وحی عطا کرتا ہے اور اسے مخلوق تک اپنا پیغام پہنچانے، اس کی تشریح کرنے اور اس پر عمل کر کے دکھانے کا مکلف بناتا ہے۔ اس کی ضرورت سمجھنے کے لیے انسان کی علمی حدود پر غور کرنا چاہیے۔ انسان حواس سے محسوسات کو اور عقل سے ان کے باہمی تعلقات کو جانتا ہے، مگر غیب کی دنیا—اللہ کی رضا کیا ہے، موت کے بعد کیا ہو گا، کون سا عمل نجات کا ذریعہ بنے گا—حواس و عقل کی رسائی سے باہر ہے۔ اگر اللہ انسان کو پیدا کر کے اسے اندھیرے میں چھوڑ دیتا تو یہ اس کی رحمت و حکمت کے خلاف ہوتا؛ اس لیے اس نے ازل سے ہر قوم میں رسول بھیجے، تاکہ قیامت کے دن کوئی یہ عذر نہ کر سکے کہ ہمیں خبر ہی نہ پہنچی (سورۃ النساء: 165)۔ قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ رسول اسی قوم کی زبان میں بھیجا جاتا ہے تاکہ پیغام پوری وضاحت سے پہنچے (سورۃ ابراہیم: 4)۔ مزید یہ کہ انسان اخلاقی اصول عقلی طور پر طے کرنے میں ہمیشہ اختلاف کا شکار رہا ہے؛ ایک معاشرے کا پسندیدہ عمل دوسرے کے نزدیک جرم رہا ہے۔ رسالت اس اختلاف کا فیصلہ وحی کے معیار سے کرتی ہے۔ اسی لیے قرآن رسول کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت قرار دیتا ہے (سورۃ النساء: 80) اور رسول کے فیصلے کے آگے دل میں تنگی نہ رکھنے کو ایمان کی علامت بتاتا ہے (سورۃ النساء: 65)۔

وحی کی حفاظت اور ہدایت کا معتبر ذریعہ

عقیدہ رسالت کی پہلی اہمیت یہ ہے کہ اسی کے ذریعے انسان کو خدا تک پہنچنے کا معتبر اور محفوظ ذریعہ ملتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام اللہ سے وحی پاتے ہیں اور اسے بغیر کمی بیشی پہنچاتے ہیں۔ قرآن نے نبی کریم ﷺ کے بارے میں فرمایا کہ وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتے؛ جو کچھ کہتے ہیں وہ وحی ہوتی ہے جو ان کی طرف بھیجی جاتی ہے (سورۃ النجم: 3-4)۔ اسی

طرح سابقہ انبیاء کے بارے میں قرآن بار بار بتاتا ہے کہ ان سب کو ایک ہی دین دیا گیا: اللہ کی بندگی اور اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ اس سے دو بڑی باتیں حاصل ہوتی ہیں: ایک یہ کہ ہدایت کا سلسلہ انسانی تراشیدہ نظریات سے الگ ایک مسلسل آسمانی سلسلہ ہے، اور دوسری یہ کہ تمام رسولوں کی تعلیم کا مرکز ایک ہونے سے دین میں وحدت قائم رہتی ہے۔ رسالت کے بغیر انسان اللہ سے تعلق کے لیے یا تو خود ساختہ رسوم بناتا ہے یا دوسرے انسانوں کو واسطہ بنا کر شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ قرآن یہ بھی واضح کرتا ہے کہ رسول بشر ہوتے ہیں؛ کھاتے پیتے ہیں، بازاروں میں چلتے ہیں (سورۃ الفرقان: 20)۔ یہ بات رسالت کی اہمیت بڑھاتی ہے، کیونکہ بشر رسول ہی بشر انسانوں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ بن سکتا ہے؛ اگر رسول فرشتہ ہوتا تو انسان عذر پیش کرتا کہ اس جیسا بننا ہمارے بس میں نہیں۔

رسول بطور عملی نمونہ اور زندہ تفسیر

عقیدہ رسالت کی دوسری بڑی اہمیت یہ ہے کہ رسول کتابی ہدایت کو عملی زندگی میں ڈھال کر دکھاتا ہے۔ قرآن نے اس مقصد کو یوں بیان کیا ہے کہ ہم نے آپ کی طرف ذکر (قرآن) نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کے سامنے وہ کچھ کھول کر بیان کر دیں جو ان کی طرف اتارا گیا ہے (سورۃ النحل: 44)۔ نماز کا حکم قرآن میں ہے مگر اس کی ہیئت، رکعات اور اوقات کا عملی تعین سیرت و سنت سے ملتا ہے؛ زکاۃ کا اصول قرآن دیتا ہے مگر نصاب و مصارف کی تفصیل رسول کی تعلیم سے معلوم ہوتی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ کے اخلاق کو "قرآن ہی آپ کا اخلاق تھا" کہہ کر اسی حقیقت کو سمیٹ دیا، جس کا مطلب ہے کہ قرآن کے احکام کی سب سے مکمل عملی تصویر سیرتِ رسول ہے۔ اس نمونے کے بغیر ایمان دعوے کی سطح پر رہ جاتا ہے۔ رسالت یہ بھی سکھاتی ہے کہ دین صرف عبادت خانے کا نام نہیں؛ رسول اللہ ﷺ نے شوہر، باپ، پڑوسی، تاجر، قاضی، سپہ سالار اور حکمران کی حیثیت سے بھی زندگی گزاری، اور یوں زندگی کا کوئی شعبہ ہدایت سے خالی نہ رہا۔ یہی جامعیت رسالت محمدی کی وہ امتیازی شان ہے جو اسے ہر دور اور ہر خطے کے انسان کے لیے قابلِ اتباع بناتی ہے۔ اس لحاظ سے رسالت کا انکار درحقیقت عملی ہدایت سے محرومی کا اعلان ہے۔

شریعت کی تکمیل اور ختمِ نبوت

رسالت کی اہمیت کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ پر آ کر یہ سلسلہ اپنی تکمیل کو پہنچ گیا۔ قرآن نے آپ ﷺ کو "خاتم النبیین" قرار دیا (سورۃ الاحزاب: 40) اور دین کی تکمیل کا اعلان فرمایا کہ آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی (سورۃ المائدہ: 3)۔ ختمِ نبوت کا مطلب یہ ہے کہ اب قیامت تک کسی نئے نبی یا نئی شریعت کی ضرورت باقی نہیں رہی، کیونکہ ہدایت اپنی مکمل، محفوظ اور جامع صورت میں موجود ہے۔ سابقہ امتوں کی کتابوں میں تحریف ہو گئی، مگر قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے خود لیا (سورۃ الحجر: 9)، اور رسول کی سیرت بھی امت کی اجتماعی روایت سے محفوظ ہے۔ اس عقیدے کے عملی ثمرات بہت بڑے ہیں: امت خود ساختہ "نبیوں" اور جعلی مہدیوں کے فتنوں سے محفوظ رہتی ہے، دین میں نئے اضافوں کا دروازہ بند رہتا ہے، اور تمام مسلمان ایک ہی کتاب و سنت کی طرف رجوع کر کے وحدت برقرار رکھ سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ختمِ نبوت امت پر یہ ذمہ داری بھی ڈالتی ہے کہ اب ہدایت کی دعوت و تبلیغ کا کام، جو انبیاء کرتے تھے، امت کو انجام دینا ہے؛ اسی لیے اسے "خیرِ امت" قرار دے کر بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کی ذمہ داری سونپی گئی (سورۃ آل عمران: 110)۔ یوں رسالت صرف ماضی کی خبر نہیں بلکہ امت کے مستقبل کے مشن کی بنیاد بھی ہے۔

جدول 2: قرآن کی روشنی میں عقیدہ رسالت کی اہمیت کے اہم پہلو

پہلو	قرآنی دلیل کا مفہوم	اہمیت
غیب کی خبر	رسولوں کے ذریعے اللہ، فرشتوں اور آخرت کی خبر ملی	انسان عذرِ وجہالت سے نکلتا ہے
وحی کی حفاظت	رسول خواہش سے نہیں بولتا، وحی بیان کرتا ہے	ہدایت کا معتبر و محفوظ ذریعہ قائم
عملی نمونہ	رسول کتاب کی تشریح کر کے دکھاتا ہے	احکام قابلِ عمل صورت اختیار کرتے ہیں

اختلافات کا پرامن فیصلہ ممکن	رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے	اطاعت کا مرکز
ہدایت کی عالمگیریت اور تسلسل ثابت	ہر قوم میں رسول بھیجا گیا	سلسلہ انبیاء
دین محفوظ؛ امت کے ذمے دعوت کا فریضہ	محمد ﷺ آخری نبی، دین مکمل	ختمِ نبوت

رسالت اور انسانی زندگی کے عملی ثمرات

قرآن کی نظر میں رسالت کا قبول کرنا زندگی کے ہر شعبے میں تبدیلی لاتا ہے۔ عقیدے کی سطح پر انسان اللہ کو صرف ماننے کے بجائے اس سے محبت اور تعلق کا راستہ پاتا ہے، کیونکہ رسول اسے اللہ کی صفات، اس کی رحمت اور اس کے پسندیدہ اعمال سے روشناس کراتا ہے۔ عبادت کی سطح پر مناسک کی شکلیں اور مقاصد واضح ہو جاتے ہیں اور ریاکاری و بدعت کی جگہ سنت کی سادگی آ جاتی ہے۔ اخلاق کی سطح پر سچائی، رحم، عفو، عاجزی اور خدمتِ خلق کے وہ معیار ملتے ہیں جن کی کیفیات رسول کی زندگی میں دکھائی دیتی ہیں۔ معاشرتی سطح پر رسول کی لائی ہوئی شریعت خاندان، میراث، تجارت اور قوانینِ عدل کی صورت میں ایک مکمل نظام دیتی ہے۔ قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ رسول اس لیے بھیجے گئے تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں (سورۃ الحدید: 25)، یعنی رسالت کا ہدف صرف روحانی نجات نہیں بلکہ عادلانہ معاشرہ بھی ہے۔ اس کے برعکس رسالت سے انکار یا اسے محض رسمی عقیدہ بنا لینے سے انسان تین محرومیوں کا شکار ہوتا ہے: ہدایت کا معیار کھو دیتا ہے، عملی نمونے سے محروم رہتا ہے، اور آخرت میں حجت تمام ہونے کے بعد عذر سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار فرماتا ہے کہ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے ہدایت پائی، اور جو منہ پھیرے گا اس کا نقصان اسی کو ہو گا۔

اختتام

خلاصہ یہ ہے کہ عقیدہ رسالت قرآن مجید میں اس لیے مرکزی اہمیت رکھتا ہے کہ یہی انسان اور خالق کے درمیان ہدایت کا پل ہے۔ اس کے بغیر نہ اللہ کی صفات کا درست علم ملتا ہے، نہ عبادت کا طریقہ، نہ اخلاق کا مکمل نمونہ، اور نہ آخرت کی تیاری کی راہ۔ رسالت نے انسان کو غیب کی معتبر خبر دی، کتاب کی زندہ تفسیر عطا کی، شریعت کو مکمل صورت

میں پہنچایا اور ختمِ نبوت کے ذریعے اس ہدایت کو قیامت تک محفوظ کر دیا۔ طالب علم کے لیے زندگی کا سبق یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے تعلق دعوے کا نہیں اتباع کا نام ہے؛ جو شخص جتنا سیرت کا مطالعہ کر کے اسے اپنی عادات، معاملات اور فیصلوں میں جگہ دے گا، اتنا ہی وہ قرآن کی مقصود زندگی کے قریب ہو گا۔

سوال نمبر 3: قرآن کریم میں آخرت پر ایمان کے انسان کے اخلاق و کردار پر کیا اثرات بیان ہوئے ہیں؟ (20 نمبر)

تعارف

ایمان بالآخرت قرآن مجید کے تین بنیادی عقائد میں سے ایک ہے۔ اس سے مراد یہ یقین ہے کہ یہ دنیا کی زندگی عارضی ہے؛ موت کے بعد انسان کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا، اس کے اعمال کا حساب ہو گا، اور نیکی و بدی کی جزا و سزا جنت و جہنم کی صورت میں ملے گی۔ قرآن نے جگہ جگہ آخرت کے ذکر کو اخلاق و کردار کی اصلاح کے ساتھ جوڑا ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ قرآن محض آخرت کے واقعات کی خبر نہیں دیتا بلکہ بار بار بتاتا ہے کہ جو شخص اس دن کی جواب دہی پر یقین رکھتا ہے، اس کی عملی زندگی بدل جاتی ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ المؤمنون میں کامیاب ایمان والوں کی صفات گناتے ہوئے ان کی نماز میں خشوع، لغو سے اعراض، زکوٰۃ کی ادائیگی، امانت و وعدے کی پاسداری اور نمازوں کی حفاظت کا ذکر کیا گیا اور آخر میں انہی کو جنت الفردوس کا وارث قرار دیا گیا۔ یہ ترتیب اتفاقی نہیں؛ قرآن یہ سکھانا چاہتا ہے کہ آخرت کا یقین اخلاق کی جڑ ہے۔ اس جواب میں ہم قرآن کی بیان کردہ انہی تاثیرات کو دیکھیں گے: ذمہ داری و احتساب کا شعور، صبر و استقامت، عدل و رحم، سخاوت و ایثار، اور گناہوں سے اجتناب، اور ساتھ یہ بھی کہ آخرت سے غفلت کے معاشرتی نقصانات کیا ہیں۔

ذمہ داری اور خود احتسابی کا شعور

آخرت پر ایمان کا سب سے پہلا اور گہرا اثر یہ ہے کہ انسان کے اندر ذمہ داری اور خود احتسابی کا مستقل شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ دنیوی قانون صرف اس جرم کو پکڑتا ہے جو ثابت ہو جائے اور جس کا کوئی گواہ موجود ہو، مگر مؤمن جانتا ہے کہ اس کا ایک ایک عمل لکھا جا رہا ہے اور ذرے برابر نیکی اور ذرے برابر برائی بھی اس کے سامنے آئے گی (سورۃ الزلزال: 7–8)۔ یہ یقین پولیس اور کیمرے سے کہیں بڑھ کر مؤثر نگرانی ہے، کیونکہ یہ تنہائی میں بھی کام کرتی ہے۔ امانت میں خیانت کرنے والا تاجر، رشوت لینے والا افسر،

اور نقل کرنے والا طالب علم اگر واقعی یہ سمجھے کہ اس عمل کا ایک دن حساب ہونا ہے تو اس کے لیے جرم مشکل ہو جاتا ہے۔ قرآن نے سورۃ القیامہ میں انسان کے ضمیر کو "نفسِ لوامہ" یعنی ملامت کرنے والے ضمیر کی قسم کھا کر اسی خود احتسابی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جیسے حکمران راتوں کو گشت کر کے رعایا کی خبر گیری کرتے کہ کہیں ان کی کوتاہی پر آخرت میں سوال نہ ہو جائے۔ آج کے نفسیاتی مطالعے بھی یہی کہتے ہیں کہ جس شخص کے سامنے اعمال کے نتائج کا طویل مدتی تصور ہوتا ہے، وہ لمحاتی خواہشات پر قابو پانے میں زیادہ کامیاب رہتا ہے۔ قرآن اسے قلبی یقین کی سطح پر لے جاتا ہے۔

صبر، استقامت اور مصائب میں توازن

دوسرا نمایاں اثر یہ ہے کہ آخرت کا یقین انسان کو صبر، استقامت اور ذہنی توازن عطا کرتا ہے۔ دنیا کی زندگی میں ناانصافیاں نظر آتی ہیں: ظالم عیش کرتا دکھائی دیتا ہے اور مظلوم محروم رہ جاتا ہے؛ محنت کش نقصان اٹھاتا ہے اور بد دیانت فائدہ اٹھا لیتا ہے۔ اگر انسان یہ سمجھے کہ بس یہی زندگی سب کچھ ہے تو مایوسی، حسد اور انتقام اس کے کردار کو بگاڑ دیتے ہیں۔ قرآن اس کشمکش کا حل آخرت سے دیتا ہے کہ یہ دنیا دارالعمل ہے، دارالجزا نہیں؛ اصل انصاف اس دن ہو گا جب نہ کسی پر ذرہ برابر ظلم ہو گا اور نہ کسی کی نیکی ضائع جائے گی (سورۃ النساء: 40)۔ یہ عقیدہ مصیبت زدہ کو حوصلہ دیتا ہے کہ اس کا صبر رائیگاں نہیں، بیمار کو امید دیتا ہے کہ اس کے دکھ کا اجر محفوظ ہے، اور شہید و مجاہد کے خاندان کو تسلی دیتا ہے کہ قربانی ابدی زندگی کا سودا ہے۔ سورۃ البقرہ میں صبر کرنے والوں کے لیے اللہ کی معیت اور صلوات و رحمت کی بشارت اسی تناظر میں دی گئی ہے۔ اس کے برعکس آخرت سے بے یقینی انسان کو ہر نقصان پر ٹوٹنے والا اور ہر نعمت پر اترانے والا بنا دیتی ہے، جسے قرآن نے "جزوعاً منوعاً" یعنی مصیبت میں گھبرایا ہوا اور بھلائی میں بخیل قرار دیا ہے (سورۃ المعارج: 20–21)۔ یوں آخرت کے یقین نے کردار کو وہ مضبوطی عطا کی جو خالص دنیوی فلسفے نہیں دے سکتے۔

عدل، رحم اور حقوق العباد کی پاسداری

تیسرا بڑا اثر حقوق العباد کی ادائیگی میں ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن سکھاتا ہے کہ قیامت کے دن صرف حقوق اللہ ہی کا نہیں، بندوں کے حقوق کا بھی سوال ہو گا؛ حتیٰ کہ مفلس اس شخص کو کہا گیا جس کی نمازیں، روزے تو موجود ہوں مگر اس نے کسی کو گالی دی ہو، کسی کا مال کھایا ہو اور کسی کا حق دبایا ہو، تو اس کی نیکیاں حق داروں میں بانٹ دی جائیں گی — یہ

مفہوم احادیث میں بیان ہوا اور قرآن کے اس اصول سے ہم آہنگ ہے کہ نامہ اعمال میں سب کچھ محفوظ ہے۔ آخرت کے اس تصور نے اخلاق کو عبادت سے جوڑ دیا: اب سچ بولنا صرف اچھی عادت نہیں، نجات کا ذریعہ ہے؛ یتیم کی کفالت صرف سماجی خدمت نہیں، جنت کا راستہ ہے؛ اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک صرف رواج نہیں، ایسا فرض ہے جس کا حساب ہونا ہے۔ قرآن نے سورۃ الماعون میں آخرت کو جھٹلانے والے کی دو علامتیں بتائی ہیں: وہ یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔ گویا آخرت کا انکار سب سے پہلے رحم اور سماجی ذمہ داری کو ختم کرتا ہے۔ اس کے برعکس مؤمن جانتا ہے کہ اس کا مال اس کے پاس امانت ہے اور اس میں سائل و محروم کا حق ہے (سورۃ الذاریات: 19)، اس لیے اس کے ہاتھ سے صدقہ، زکاۃ اور خدمتِ خلق فطری انداز میں جاری رہتی ہے۔ یوں آخرت نے اخلاق کو قانونی مجبوری کے بجائے دل کی چاہت بنا دیا۔

گناہ سے اجتناب اور تقویٰ کی زندگی

چوتھا اثر گناہ سے اجتناب اور تقویٰ کی پائیدار زندگی ہے۔ قرآن جہاں بھی بڑے گناہوں کی ممانعت کرتا ہے، وہاں ساتھ آخرت کے عذاب کی وعید اور جنت کی بشارت جوڑ دیتا ہے، تاکہ ممانعت کی وجہ صرف سماجی بدنامی نہ ہو بلکہ ابدی انجام ہو۔ سود کے ترک کرنے کا حکم دیتے ہوئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کی وعید سنائی گئی (سورۃ البقرہ: 279)، قتلِ ناحق پر جہنم کی ہمیشگی کی سزا بیان ہوئی (سورۃ النساء: 93)، اور یتیم کا مال کھانے کو پیٹ میں آگ بھرنے سے تعبیر کیا گیا (سورۃ النساء: 10)۔ یہ اندازِ تربیت اس لیے مؤثر ہے کہ انسان جن گناہوں کو چھپ کر کرتا ہے، وہاں اسے صرف آخرت کا خوف ہی روک سکتا ہے۔ اسی خوف کا نام تقویٰ ہے، اور قرآن تقویٰ کو تمام نیکیوں کی جڑ اور زادِ راہ میں سب سے بہترین زاد قرار دیتا ہے (سورۃ البقرہ: 197)۔ یہاں یہ نکتہ بھی واضح رہے کہ قرآن خوف کے ساتھ امید کو بھی رکھتا ہے؛ جنت کی نعمتوں، اللہ کی رضا اور دیدار کی بشارتیں انسان کو نیکی پر ابھارتی ہیں۔ خوف و رجا کا یہ توازن کردار کو نہ تو مایوس ہونے دیتا ہے اور نہ بے باک۔ اسلامی اخلاقیات کی اصطلاح میں یہی کیفیت احسان ہے کہ انسان اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا اسے دیکھ رہا ہے، اور یہ درجہ آخرت کے یقین کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

جدول 3: ایمان بالآخرت کے اخلاق و کردار پر اثرات کا خلاصہ

کردار میں تبدیلی	قرآنی بنیاد کا مفہوم	اثر
تنہائی میں بھی خیانت و جرم سے پرہیز	ذرے برابر عمل بھی پیش ہو گا	خود احتسابی
مصیبت میں مایوسی اور انتقام سے بچاؤ	اصل جزا آخرت میں ملے گی	صبر و توازن
یتیم، مسکین اور کمزور کے حق کی ادائیگی	حقوق العباد کا حساب ہو گا	عدل و رحم
بخل ختم؛ مال خدمتِ خلق میں خرچ	صدقے کا اجر اللہ کے پاس محفوظ	سخاوت و ایثار
چھپے گناہوں سے اجتناب، نیکی کی حرص	عذاب کی وعید و جنت کی بشارت	تقویٰ و پرہیز
چھوٹی نیکی کی قدر؛ مسلسل اصلاحِ عمل	نیکی ضائع نہیں ہو گی	امید و رجاء

آخرت سے غفلت کے اخلاقی نقصانات

قرآن نے سکہ کا دوسرا رخ بھی دکھایا ہے کہ آخرت سے غفلت کردار کو کس سمت لے جاتی ہے۔ سورۃ الکہف میں ان لوگوں کا ذکر ہے جن کی ساری کوشش دنیوی زندگی میں گم ہو گئی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ بڑے اچھے کام کر رہے ہیں۔ غفلت کا پہلا نقصان مقصد کا بگاڑ ہے: انسان ڈگری، نوکری اور دولت ہی کو کامیابی سمجھ بیٹھتا ہے اور ان کے لیے ہر ناجائز حربہ جائز کر لیتا ہے۔ دوسرا نقصان خود غرضی ہے، کیونکہ جسے مرنے کے بعد کسی کے سامنے جواب نہیں دینا، اس کے نزدیک دوسروں کے حقوق محض رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ تیسرا نقصان مایوسی اور بے چینی ہے؛ دنیوی ناکامی اس کے لیے سب کچھ ختم کر دینے کے برابر ہوتی ہے، اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ اللہ کے ذکر سے اعراض کرنے والے کی زندگی تنگ ہو جاتی ہے (سورۃ طٰہٰ: 124)۔ چوتھا نقصان یہ ہے کہ موت کی یاد سے فرار انسان کو ظلم پر جرأت دلاتا ہے؛ قرآن نے بنی اسرائیل کے بعض گروہوں اور منافقین کے کردار کو اسی روشنی میں پرکھا ہے۔ اس تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت پر ایمان کوئی اضافی عقیدہ نہیں بلکہ اخلاقی نظام کی وہ روح ہے جس کے نکل جانے سے نماز و روزہ بھی محض رسم رہ جاتا ہے اور معاشرہ انسانوں کا ایسا ہجوم بن جاتا ہے جہاں ہر طاقتور کمزور کو کھا جانے کے درپے ہوتا ہے۔

اختتام

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک آخرت پر ایمان اخلاق و کردار کا سب سے بڑا محرک ہے۔ یہ یقین انسان کو خود احتسابی سکھاتا ہے، مصائب میں صبر و توازن عطا کرتا ہے، عدل و رحم اور حقوق العباد کی حفاظت پر آمادہ کرتا ہے، سخاوت و ایثار پیدا کرتا ہے اور پوشیدہ گناہوں سے روک کر تقویٰ کی زندگی بخشتا ہے۔ اس کے بغیر اخلاق محض رسم و رواج یا قانونی خوف کا نام رہ جاتا ہے جو موقع ملتے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ طالب علم کے لیے عملی سبق یہ ہے کہ وہ اپنے کردار کی جانچ اس سوال سے کرے کہ اگر آج اس کے اعمال کھول دیے جائیں تو اس کا اپنا ضمیر مطمئن ہو گا یا نہیں؛ یہی روزمرہ کا محاسبہ آخرت کے تصور کو بار بار عقیدے سے زندہ کردار میں بدل دیتا ہے۔

سوال نمبر 4: عبادات کا حقیقی مقصد قرآنی تناظر کی روشنی میں تفصیل سے لکھیں۔ (20 نمبر)

تعارف

قرآن مجید نے انسان کی تخلیق کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ جن و انس کو صرف اس لیے پیدا کیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں (سورۃ الذاریات: 56)۔ اس آیت نے عبادت کو انسانی زندگی کا مرکز قرار دیا، مگر ساتھ ہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ عبادتوں کا حقیقی مقصد کیا ہے؟ کیا اللہ کو ہماری نمازوں اور روزوں کی ضرورت ہے؟ قرآن کا جواب واضح ہے کہ اللہ بے نیاز ہے؛ عبادت کا فائدہ خود انسان کو پہنچتا ہے۔ جو شخص نیکی کرتا ہے وہ اپنے ہی لیے کرتا ہے اور اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے (سورۃ العنکبوت: 6)۔ اس لیے عبادات کا مقصد حرکات و سکنات کی مشق نہیں بلکہ انسان کی اندرونی و بیرونی اصلاح ہے: اس کے دل میں تقویٰ پیدا ہو، اس کے اخلاق سنوریں، اس کا معاشرہ پاکیزہ ہو اور اس کا تعلق اپنے خالق سے مضبوط ہو۔ قرآن نے ہر بڑی عبادت کے ساتھ اس کا مقصد بھی بیان کیا ہے: روزے کے ساتھ تقویٰ، نماز کے ساتھ بے حیائی و برائی سے روک، زکاۃ کے ساتھ پاکیزگی، اور حج کے ساتھ دینی و دنیوی منافع اور اجتماعیت۔ اس جواب میں ہم عبادت کے وسیع قرآنی مفہوم، پھر نماز، روزہ، زکاۃ، حج، ذکر و دعا کے مقاصد، اور آخر میں اس اصول پر بات کریں گے کہ شکل کے ساتھ روح کی موجودگی ہی عبادت کو مقبول بناتی ہے۔

عبادت کا قرآنی مفہوم اور اس کا اصل ہدف: تقویٰ

عبادت کا لغوی مطلب ہے عاجزی و اطاعت کے ساتھ جھکنا، اور قرآن کی اصطلاح میں عبادت ہر اس قول و عمل کا نام ہے جو اللہ کو پسند ہو اور اس کی رضا کے لیے کیا جائے۔ اس وسیع مفہوم میں نماز و روزہ بھی آتے ہیں اور حلال روزی کمانا، والدین کی خدمت، سچ بولنا اور مریض کی عیادت بھی، بشرطیکہ نیت اللہ کی رضا ہو۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم میں بھی عبادت کا یہ جامع تصور ملتا ہے جس میں نیکی کے چھوٹے سے چھوٹے عمل، حتیٰ کہ راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانے کو بھی صدقہ قرار دیا گیا۔ اس جامعیت کے باوجود ارکانِ اسلام کو عبادت کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے، کیونکہ یہی باقاعدہ تربیت کے وہ ذرائع ہیں جو انسان کو باقی زندگی میں اللہ کی اطاعت پر قائم رکھتے ہیں۔ قرآن نے تمام عبادات کا مشترکہ مقصد تقویٰ بیان کیا ہے، یعنی اللہ کے خوف اور اس کی نگرانی کے احساس کے ساتھ زندگی گزارنا۔ سورۃ البقرہ میں نماز و روزہ کی فرضیت سے پہلے ”اے ایمان والو“ کہہ کر خطاب اور روزے کے اختتام پر ”تاکہ تم پرہیز گار بنو“ کہہ کر اس ربط کو واضح کیا گیا ہے۔ تقویٰ دل کی وہ کیفیت ہے جس سے انسان کا دل نرم ہوتا ہے، ضمیر بیدار رہتا ہے اور اعمال میں اخلاص آتا ہے۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ عبادت کارخانے کی وہ مشین نہیں جس سے صرف حرکات نکلتی ہیں، بلکہ تربیت گاہ ہے جس سے پرہیز گار انسان تیار ہوتا ہے۔

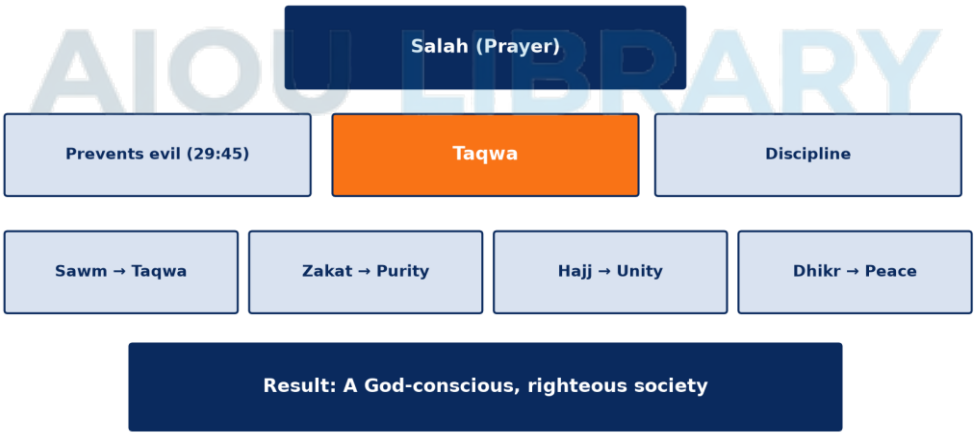


Figure 2: Acts of worship and their real purposes in the Quran

شکل 2: عبادات اور ان کے حقیقی مقاصد — نماز، روزہ، زکاۃ، حج اور ذکر سب تقویٰ اور صالح معاشرے کی تعمیر کے لیے ہیں۔

نماز کا مقصد: برائی سے روک اور یادِ الٰہی

نماز پانچ وقت کی فرض عبادت ہے اور قرآن نے اس کے مقاصد نہایت وضاحت سے بیان کیے ہیں۔ پہلا مقصد اللہ کی یاد ہے: ”میری یاد کے لیے نماز قائم کرو“ (سورۃ طٰہٰ: 14)۔ دن میں پانچ مرتبہ دنیا کے کاموں سے کٹ کر خالق کے حضور کھڑا ہونا انسان کو بار بار یاد دلاتا ہے کہ وہ آزاد نہیں، ایک بڑی ہستی کا بندہ ہے؛ یہی یاد غرور، غفلت اور خود پسندی کا علاج ہے۔ دوسرا مقصد اخلاقی اصلاح ہے: ”بے شک نماز بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روکتی ہے“ (سورۃ العنکبوت: 45)۔ جو نماز انسان کو جھوٹ، خیانت اور ظلم سے نہ روکے، مفسرین کے نزدیک اس کی روح ناقص ہے، کیونکہ سجدے میں جھکنے والا سر بار بار آ کر کسی بے قصور پر ظلم کرے تو یہ نماز کی تعلیم کے خلاف ہے۔ تیسرا مقصد معاشرتی نظم و ضبط ہے: اوقات کی پابندی، صف بندی میں مساوات، امام کی اقتدا میں اطاعت کی تربیت، اور جمعہ و جماعت کے ذریعے محلے اور شہر کے لوگوں کا باہمی رابطہ۔ چوتھا مقصد روحانی سکون ہے؛ قرآن دلّوں کے اطمینان کو اللہ کے ذکر سے جوڑتا ہے (سورۃ الرعد: 28) اور نماز اس ذکر کی اعلیٰ ترین صورت ہے۔ ان مقاصد سے واضح ہوتا ہے کہ نماز صرف جسمانی ورزش یا رسمی فرض کی ادائیگی نہیں بلکہ روزانہ پانچ مرتبہ ہونے والی وہ انقلابی تربیت ہے جو انسان کے وقت، جسم، مال (وضو و لباس کی پاکیزگی)، ذہن اور معاشرتی تعلقات سب کو خدائی نظام کے تابع کرتی ہے۔

روزے اور زکاۃ کے مقاصد: تقویٰ، ہمدردی اور تزکیہ

روزے کی فرضیت بیان کرتے ہوئے قرآن نے اس کا مقصد ایک لفظ میں سمیٹ دیا: ”تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو“ (سورۃ البقرہ: 183)۔ روزہ انسان کو حلال چیزوں — کھانے، پینے اور خواہشات — سے بھی مقررہ وقت میں روک کر یہ تربیت دیتا ہے کہ جو شخص اللہ کے حکم پر حلال چھوڑ سکتا ہے، وہ حرام کے قریب کیسے جائے گا؟ یہی مشق ضبطِ نفس کی بنیاد ہے۔ روزے کا دوسرا مقصد غریبوں اور بھوکوں کے درد کا عملی احساس ہے؛ جو خود بھوک و پیاس سہتا ہے، اس کے دل میں مسکین کے لیے رحم پیدا ہوتا ہے۔ تیسرا مقصد صحت و سادگی اور فضول خرچی سے پرہیز ہے، بشرطیکہ افطار کی میزیں اسراف کا نمونہ نہ بن جائیں۔ اسی طرح زکاۃ کے مقصد کو قرآن نے یوں بیان کیا: ”ان کے مالوں سے صدقہ لو تاکہ ان کو پاک و صاف کرو“ (سورۃ التوبہ: 103)۔ زکاۃ مال کو بھی پاک کرتی ہے اور مالک کے دل کو بخل و حرص سے بھی۔ معاشرتی سطح پر زکاۃ دولت کی گردش

کو یقینی بناتی ہے تاکہ مال صرف مالداروں ہی کے درمیان نہ گھومتا رہے (سورۃ الحشر: 7)۔ اس کے مصارف میں فقراء، مساکین، مقروض اور مسافر شامل ہیں، جو اس بات کی دلیل ہے کہ عبادت کا یہ رکن براہِ راست معاشرتی انصاف کا نظام ہے۔ روزہ انفرادی ضبط اور زکاۃ اجتماعی عدل سکھاتی ہے؛ دونوں مل کر بتاتے ہیں کہ قرآن کی عبادات انسان کو معاشرے سے کاٹتی نہیں بلکہ اس سے ذمہ داری کے ساتھ جوڑتی ہیں۔

حج، قربانی، ذکر اور دعا کے مقاصد

حج زندگی میں ایک بار کی وہ عظیم عبادت ہے جس میں عبادت کے تقریباً تمام مقاصد جمع ہو جاتے ہیں۔ قرآن نے حج کے مقصد میں یہ فرمایا کہ لوگ دور دراز سے آئیں تاکہ اپنے فائدے کی جگہوں پر حاضر ہوں اور مقررہ دنوں میں اللہ کا نام لیں (سورۃ الحج: 28)۔ احرام کا سادہ لباس بادشاہ، فقیر کا ظاہری فرق مٹا کر مساوات کا عملی سبق دیتا ہے؛ طواف و سعی انسان کو حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام کی قربانیوں کی یاد سے جوڑتے ہیں؛ عرفات کا اجتماع قیامت کے میدان کی جھلک دکھاتا ہے؛ اور قربانی یہ سکھاتی ہے کہ اللہ کو نہ گوشت پہنچتا ہے نہ خون، اس تک صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے (سورۃ الحج: 37)۔ یہ آیت تمام عبادات کے روحانی مقصد کی جامع ترین تعبیر ہے کہ ظاہری صورت نہیں، باطنی کیفیت مقصود ہے۔ اسی طرح ذکر و دعا کا مقصد اللہ سے زندہ تعلق قائم رکھنا ہے؛ قرآن کہتا ہے کہ اللہ بندے کے قریب ہے اور پکارنے والے کی پکار سنتا ہے (سورۃ البقرہ: 186)۔ دعا انسان کو مایوسی سے بچاتی، تکبر سے روکتی اور فیصلہ سازی میں اللہ پر توکل سکھاتی ہے۔ یوں حج اجتماعیت و مساوات، قربانی اخلاص و ایثار، اور ذکر و دعا تعلق و سکون کے مقاصد پورے کرتے ہیں۔

جدول 4: اہم عبادات اور ان کے قرآنی مقاصد

عبادت	قرآنی مقصد	زندگی پر اثر
نماز	یادِ الٰہی؛ بے حیائی و برائی سے روک	نظم و ضبط، پاکیزگی، اخلاقی نگرانی
روزہ	تقویٰ کا حصول	ضبطِ نفس، بھوکوں سے ہمدردی، صبر

دولت کی گردش، غربت میں کمی، سماجی انصاف	مال و نفس کی پاکیزگی	زکاۃ
امت کی وحدت، مساوات، قربانی کا جذبہ	اللہ کا ذکر اور دینی و دنیوی منافع	حج
اخلاص، ایثار، جان و مال کی قربانی کا استعداد	تقویٰ اللہ تک پہنچتا ہے	قربانی
سکون، توکل، مایوسی سے نجات	دلوں کا اطمینان، قربِ الٰہی	ذکر و دعا

صورت کے ساتھ روح: قبولیت کی شرط

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ اصول ہے کہ عبادت کی صورت اور روح دونوں مطلوب ہیں۔ قرآن نے اس شخص کو ماکت کی وعید سنائی جو نماز میں سستی اور دکھاوا کرتا ہے اور معمولی ضرورت کی چیز بھی روک لیتا ہے (سورۃ الماعون)، اور نماز میں خشوع رکھنے والوں کو کامیاب قرار دیا (سورۃ المؤمنون 23:1-2)۔ خشوع کا مطلب ہے دل کا حاضر ہونا، اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا شعور اور دنیا کے خیالات سے کٹ کر توجہ مرکوز کرنا۔ اسی طرح عیدین کی نماز، نرا دو رکعت، تلاوتِ قرآن اور نفل عبادات کا مقصد بھی نیکی کی مشق اور اللہ سے تعلق کی تجدید ہے۔ یہاں فرق واضح رہے کہ عبادت کے "مقاصد" جاننا اس لیے ضروری نہیں کہ مقصد حاصل ہو جائے تو عبادت چھوڑ دی جائے؛ نماز اس لیے بھی فرض ہے کہ اللہ کا حکم ہے، اور اس کے مقاصد اس حکم کی حکمتیں ہیں۔ اطاعت پہلے ہے، حکمت کی معرفت اس کے بعد ذوق و شوق پیدا کرتی ہے۔ یہی توازن قرآن کا اسلوب ہے: وہ حکم بھی دیتا ہے اور اس کی حکمت بھی سمجھاتا ہے، تاکہ انسان اندھی تقلید کے بجائے شعوری بندگی اختیار کرے۔ جب یہ شعور پیدا ہو جائے تو عبادت بوجھ نہیں رہتی، زندگی کی سب سے پر لذت اور بامقصد سرگرمی بن جاتی ہے۔

اختتام

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی روشنی میں عبادات کا حقیقی مقصد اللہ کی بے نیاز ذات کو فائدہ پہنچانا نہیں بلکہ انسان کی مکمل اصلاح ہے: نماز یادِ الٰہی اور برائی سے حفاظت کے لیے، روزہ تقویٰ و ضبطِ نفس کے لیے، زکاۃ تزکیہ و سماجی انصاف کے لیے، حج وحدت و مساوات کے لیے، اور ذکر و دعا قلبی سکون و تعلق کے لیے ہے۔ ان سب کا مشترکہ ثمر ایک

پرہیز گار، ذمہ دار اور نافع انسان ہے جو معاشرے کے لیے رحمت بنتا ہے۔ طالب علم کے لیے سبق یہ ہے کہ وہ عبادت کو رسم سمجھ کر ادا نہ کرے بلکہ ہر عبادت سے پہلے اس کے مقصد کو یاد کرے اور ادائیگی کے بعد اپنے کردار میں اس کے اثر کو جانچے؛ یہی جانچ عبادت کو قبولیت کے درجے تک لے جاتی ہے۔

سوال نمبر 5: اسوہ حسنہ سے مراد کیا ہے؟ نبی کریم ﷺ کی سیرت امت کے لیے کس طرح نمونہ عمل ہے؟ (20 نمبر)

تعارف

قرآن مجید نے نبی کریم ﷺ کی زندگی کو امت کے لیے "اسوہ حسنہ" یعنی بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔ سورۃ الاحزاب میں ارشاد ہے کہ تمہارے لیے اللہ کے رسول میں عمدہ نمونہ ہے، اس شخص کے لیے جو اللہ کی اور آخرت کے دن کی امید رکھتا ہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتا ہو (سورۃ الاحزاب 33: 21)۔ یہ آیت غزوہ احزاب کے پس منظر میں نازل ہوئی، جب مدینہ چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا تھا اور اس نازک موقع پر رسول اللہ ﷺ کا صبر، ثابت قدمی اور اللہ پر توکل مومنوں کے لیے نمونہ پیش کیا گیا۔ مگر مفسرین کے نزدیک آیت کا مفہوم عام ہے: زندگی کے ہر شعبے میں آپ ﷺ کی سیرت قابلِ تقلید معیار ہے۔ سوال کے دو حصے ہیں: پہلا یہ کہ اسوہ حسنہ سے مراد کیا ہے، اور دوسرا یہ کہ سیرتِ طیبہ عملی طور پر امت کے لیے کس طرح نمونہ عمل ہے۔ اس جواب میں پہلے اسوہ کا لغوی و اصطلاحی مفہوم اور اس کی شرائط بیان ہوں گی، پھر سیرت کے اہم شعبوں — عبادت و اخلاق، گھریلو و معاشرتی زندگی، عدل و قیادت، صبر و معافی — میں اس نمونے کی تفصیل پیش کی جائے گی، اور آخر میں آج کے مسلمان کے لیے اس اتباع کی عملی صورتیں زیر بحث آئیں گی۔

اسوہ حسنہ کا مفہوم اور اس کی شرائط

"اسوہ" عربی زبان میں اس نمونے، مثال اور روش کو کہتے ہیں جس کی پیروی کی جائے اور جس کے نقشِ قدم پر چلا جائے، اور "حسنہ" کا مطلب ہے اچھا، عمدہ اور قابلِ ستائش۔ اس طرح اسوہ حسنہ سے مراد وہ بہترین اور مکمل عملی نمونہ ہے جو قول کے ساتھ فعل سے بھی رہنمائی کرے اور جس کی پیروی انسان کو خیر و کمال تک پہنچائے۔ عام اساتذہ اور مصلحین کا نمونہ جزوی ہوتا ہے: کوئی علم میں کامل ہوتا ہے تو عمل میں کمزور، کوئی عبادت میں آگے ہوتا ہے تو معاملات میں پیچھے۔ رسول اللہ ﷺ کا اسوہ اس لیے "حسنہ" بھی

ہے اور جامع بھی کہ آپ کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس میں امت کے لیے رہنمائی موجود نہ ہو؛ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے آپ کے اخلاق کو "خلقِ عظیم" قرار دیا (سورۃ القلم: 4)۔ آیت میں اتباع کے لیے تین کیفیات کی طرف بھی اشارہ موجود ہے: اللہ سے ملاقات کی امید، آخرت کے دن کی تیاری، اور اللہ کا کثرت سے ذکر۔ مطلب یہ کہ اسوے سے حقیقی فائدہ وہی اٹھاتا ہے جس کا دل اللہ اور آخرت سے جڑا ہو اور جو ذکر سے اس تعلق کو تازہ رکھتا ہو۔ یہاں ایک اہم اصولی نکتہ بھی سمجھنا چاہیے کہ ہر دور کے فقہاء و محدثین نے سیرت کے افعال کی درجہ بندی کی ہے: بعض افعال عبادت کے طور پر سب کے لیے نمونہ ہیں، بعض آپ ﷺ کے منصبِ نبوت کے خاصے ہیں جن میں تقلید کی گنجائش نہیں، اور بعض دنیوی معاملات میں مباح اور تجربے کے درجے میں ہیں۔ اس درجہ بندی کا تعین اہلِ علم کی تشریح سے ہوتا ہے، اس لیے اتباع ہمیشہ علم کے ساتھ ہونا چاہیے، جذبات کے ساتھ اندھی نقل نہیں۔

عبادت و تعلق باللہ میں نمونہ

سیرت کا پہلا اور بنیادی نمونہ اللہ کی عبادت اور اس سے تعلق میں ہے۔ آپ ﷺ کی راتیں قیام میں گزرتیں؛ نبی نمازوں میں پاؤں مبارک پر ورم آ جاتا، اور جب عرض کیا گیا کہ آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف ہیں (یعنی آپ معصوم و مغفور ہیں) تو فرمایا کہ کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ یہ جواب عبادت کی روح سکھاتا ہے کہ بندگی محض ثواب کی کمائی نہیں بلکہ محبت و شکر کا اظہار ہے۔ آپ ﷺ کی نماز میں خشوع، روزوں میں کثرت، ذکر میں استمرار، اور دعاؤں میں عاجزی و گریہ امت کے لیے وہ تصویر ہے جس سے عبادت میں ذوق پیدا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی آپ ﷺ نے عبادت میں میانہ روی بھی سکھائی: تین اشخاص نے جب ہمیشہ روزے، ساری رات نماز اور ترکِ نکاح کا عزم ظاہر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں روزہ رکھتا بھی ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور میرا یہی طریقہ سنت ہے؛ جو اس سے منہ موڑے گا وہ میرے طریقے پر نہیں۔ یہ نمونہ امت کو رہبانیت اور غفلت دونوں انتہاؤں سے بچاتا ہے۔ قرآن نے اسی جامعیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ ﷺ سے اعلان کروایا کہ میری نماز، میری قربانی اور میرا جینا مرنا اللہ ہی کے لیے ہے (سورۃ الانعام: 162)۔ طالب علم کے لیے سبق یہ ہے کہ اسوے کا آغاز عبادت میں باقاعدگی، اخلاص اور اعتدال سے ہوتا ہے، نہ کہ صرف دعوؤں سے۔

اخلاق و کردار میں نمونہ

اخلاق کے میدان میں سیرت سب سے روشن نمونہ ہے۔ بعثت سے پہلے ہی مکہ والے آپ ﷺ کو "الصادق الامین" کہتے تھے؛ وحی کے بعد یہ اخلاق شریعت کا حصہ بن گئے۔ آپ ﷺ کی سچائی، وعدے کی پابندی، امانت داری اور نرم گفتاری ہر طبقے کے لیے معیار ہے۔ غصے پر قابو کا حال یہ تھا کہ ذاتی معاملے میں کبھی انتقام نہ لیا؛ طائف کے میدان میں پتھر کھا کر بھی قوم کے لیے بد دعا کے بجائے ہدایت کی دعا کی۔ عفو و درگزر کی عظیم ترین مثال فتح مکہ ہے جب قدرت کے باوجود عام معافی کا اعلان ہوا۔ سخاوت کا یہ عالم تھا کہ مانگنے والے کو خالی ہاتھ نہ لوٹایا، اور خود گھر میں فاقے کی نوبت آ جاتی۔ عاجزی کی کیفیت یہ تھی کہ خود اپنے کام کر لیتے، غلاموں اور خادموں کے ساتھ کھانا کھاتے، بچوں کو سلام میں پہل کرتے، اور بیمار کی عیادت کو حق المسلم قرار دیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی گواہی ہے کہ دس سال خدمت میں آپ ﷺ نے کبھی "اف" تک نہ کہا۔ قرآن کی تعبیر میں آپ ﷺ مومنوں کے لیے نرم دل اور کفار کے مقابل مضبوط، اصحاب کے درمیان رحمت و شفقت کی تصویر تھے (سورۃ الفتح: 29)۔ آج خاندانی جھگڑوں، تجارتی بد دیانتی اور سماجی انتشار کا بڑا سبب اخلاقی زوال ہے؛ اس کا علاج سیرت کے اسی نمونے میں موجود ہے، جسے اپنائے بغیر محض نعروں سے معاشرہ نہیں سدھرتا۔

گھریلو، معاشرتی اور قائدانہ زندگی میں نمونہ

سیرت کا تیسرا وسیع میدان گھریلو اور اجتماعی زندگی ہے۔ شوہر کی حیثیت سے آپ ﷺ اہلِ خانہ کے کاموں میں شریک ہوتے، ان کے جذبات کا احترام کرتے اور فرمایا کہ تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو۔ باپ اور نانا کی حیثیت سے شفقت کی مثالیں سیرت کی کتابوں میں بھرپور ہیں۔ پڑوسی کے حقوق پر اتنا زور دیا کہ صحابہ کو گمان ہوا کہ اسے وارث نہ بنا دیا جائے۔ معاشرتی عدل کی صورت میں مسجدِ نبوی کو تعلیم، مشاورت اور فیصلوں کا مرکز بنایا گیا، مہاجرین و انصار کے درمیان مؤاخات (بھائی چارے) کا انوکھا نظام قائم کر کے معاشی و سماجی توازن پیدا کیا گیا، اور میثاقِ مدینہ کے ذریعے مختلف قبائل و مذاہب کے شہریوں کے حقوق و فرائض متعین کر کے پرامن بقائے باہمی کی بنیاد رکھی گئی۔ قیادت و حکمرانی میں شورائی مزاج، اہلیت پر تقرری، قانون کی بالادستی اور ذاتی مفاد سے بالاتر ہونا آپ ﷺ کا طرہ امتیاز تھا؛ مسجد میں منبر پر کھڑے ہو کر اعلان کیا گیا کہ اگر میری ذات سے کسی کا حق رہ گیا ہو تو وہ بدلہ لے لے۔ جنگی اخلاق میں بچوں، عورتوں، بوڑھوں کے قتل، درختوں کی تباہی اور امان دینے والوں سے

بدعہدی کی ممانعت انسانی حقوق کی تاریخ کا روشن باب ہے۔ یہاں یہ بات بطور علمی امانت نوٹ کرنی چاہیے کہ سیرت کے ان واقعات کی روایتی تفصیلات کی تحقیق اور ان سے فقہی احکام کا استنباط مستند سیرت نگاروں اور اہلِ علم کا کام ہے؛ عام طالب علم کو چاہیے کہ وہ معتبر کتابوں سے مطالعہ کرے اور کسی اختلافی معاملے میں ذاتی رائے سے حکم نہ لگائے۔

جدول 5: سیرتِ طیبہ بطور اسوۂ حسنہ — اہم شعبے اور آج کے لیے سبق

شعبہ	سیرت کا نمونہ	آج کے مسلمان کے لیے سبق
عبادت	قیام اللیل، خشوع، ذکر میں استمرار	عبادت میں باقاعدگی، اخلاص اور اعتدال
اخلاق	صدق و امانت، عفو، سخاوت، عابری	ذاتی بدلہ ترک؛ خدمت و نرمی کو عادت بنانا
گھریلو زندگی	اہلِ خانہ سے محبت و تعاون	گھر والوں کے حقوق و جذبات کا احترام
معاشرت	مؤاخات، میثاقِ مدینہ، پڑوسی کے حقوق	بھائی چارہ، پرامن بقائے باہمی، عدل
قیادت	مشاورت، اہلیت، قانون کی بالادستی	دیانت دار قیادت و ذمہ داری کا احساس
صبر و دعوت	طائف و احزاب میں ثابت قدمی	مشکل میں توکل؛ دعوت میں حکمت و نرمی

امت کے لیے نمونہ عمل ہونے کی وجوہات اور عملی تقاضے

اب سوال کے دوسرے حصے کا جامع جواب یہ ہے کہ سیرت امت کے لیے نمونہ عمل اس لیے ہے کہ اولاً یہ وحی کی تصدیق یافتہ زندگی ہے؛ جس کردار کو اللہ نے خود پسند فرمایا ہو، اس سے بہتر معیار کہیں اور نہیں مل سکتا۔ ثانیاً یہ نمونہ محض مثالی یا خیالی نہیں، تاریخی طور پر محفوظ ہے؛ آپ ﷺ کی زندگی کے چھوٹے بڑے واقعات اس کثرت اور تفصیل سے محفوظ ہیں کہ چودہ صدیوں بعد بھی طالب علم آپ کی صبح و شام، گھر و بازار اور امن و جنگ کی کیفیات کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ ثالثاً یہ نمونہ زندگی کے تمام درجوں کو محیط

ہے: غریب و امیر، عالم و ان پڑھ، حکمران و رعایا، جوان و بوڑھا ہر ایک اپنے مقام کے مطابق رہنمائی پا سکتا ہے۔ رابعاً اس اتباع کا نتیجہ قرآن نے اللہ کی محبت اور گناہوں کی مغفرت سے جوڑا ہے: ”اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا“ (سورۃ آل عمران: 31)۔ عملی تقاضے یہ ہیں کہ اتباع علم سے شروع ہو: سیرت کا باقاعدہ مطالعہ، اہل علم سے رہنمائی، اور پھر چھوٹی چھوٹی عادات سے آغاز — سچ بولنا، وعدہ نبھانا، وقت کی پابندی، والدین کی خدمت، مسکرا کر ملنا، اور حقوق کی ادائیگی۔ امت کی تاریخ میں جب بھی احیاء ہوا، سیرت کی طرف رجوع ہی سے ہوا، اور آج کی انفرادی و اجتماعی اصلاح کا راستہ بھی اسی نمونے سے ہو کر گزرتا ہے۔

اختتام

خلاصہ یہ ہے کہ اسوہ حسنہ سے مراد نبی کریم ﷺ کی وہ مکمل، محفوظ اور وحی سے مصدقہ زندگی ہے جسے قرآن نے ہر اس شخص کے لیے بہترین نمونہ قرار دیا جو اللہ اور آخرت کی امید رکھتا ہو۔ عبادت سے اخلاق تک، گھر سے ریاست تک، اور امن سے آزمائش تک، سیرت کا ہر پہلو امت کے لیے چراغ راہ ہے۔ طالب علم کے لیے سبق یہ ہے کہ اسوے پر بحث زبانی عقیدت تک محدود نہ رہے بلکہ مطالعہ، علم اور تدریجی عمل کے ذریعے اسے اپنی شخصیت کا حصہ بنایا جائے؛ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی محبت کا سچا ثبوت آپ کی سنت پر چلنا ہے، اور یہی اتباع دنیا میں کردار کی عظمت اور آخرت میں اللہ کی محبت و مغفرت کا ذریعہ ہے۔